OPEN ACCESS
RUSHD
(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)
Published by: *Lahore Insititute for Social Sciences, Lahore.*

ISSN (Print): 2411-9482
ISSN (Online): 2414-3138
Jan-June-2023
Vol: 4, *Issue:* 1
journalrushd@gmail.com**Email:**
OJS: https://rushdjournal.com/index

Farhad Ali[1]

Muhammad Shafiq[2]

اہل فترۃ کی تعیین اور نسخ یہودیت وعیسائیت کی بابت ایک اشتباہ کا ازالہ

Determination the Ahl e Fatrah and removal a misconception about the abrogation of Judaism and Christianity

Abstract

The final result of the Ahl e Fatrah (أهل الفترة) is a controversial issue, and there are three statements by researchers about their final result. Which include being saved, being punished, and being tested on the Day of Judgment. While a total of eight sayings have been narrated about the people affiliated with the Ahl e Fatrah. In view of a verse which says that faith in God alone, faith in the Day of Judgment and good deeds are sufficient for salvation in the Hereafter, there is a misconception about the Jews and Christians of the present age whether they are also affiliated with the people of Ahl e Fatrah? Is the salvation of the followers of the Divine Books of the present age possible only by believing in Allah and the Last Day? The theory of unity of religions has made these

1 PhD Research Scholar, HITEC University, Taxila

2 Ph.D Scholar Department of Islamic Studies The University of Lahore

questions very important, so the solution to these questions has been presented in this research paper. This research leads to the fact that belief in Allah and the Last Day alone can bring salvation only to those Jews and Christians to whom the message of the Prophet Hood has not reached at all, or in a vague way that which does not complete the argument. And the verses of the Qur'an which only mention Allah, the Last Day and the righteous deeds as the means of salvation, also include faith in the prophet hood of the Prophet.

Key Words: Ahl e Fatrah, unity of religions, salvation, previous religions, Completion of argument.

تعارف اور ضرورت واہمیت

اسلام اگرچہ تمام کفار کو جہنمی قرار نہیں دیتا بلکہ اس سلسلہ میں "اتمامِ حجت" کا قانون متعارف کراتا ہے جس کی رُو سے صرف وہ کفار جہنمی قرار پاتے ہیں جن پر حجت قائم ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وہ کفار جن پر حجت قائم نہیں ہوتی، کافر ہونے کے باوجود نجات یافتہ متصور ہوتے ہیں، علامہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔[1] امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اتمامِ حجت وعدمِ اتمام حجت کے اعتبار سے کفار کو تین طرح منقسم فرمایا ہے، دو طرح کے کفار کو نجات یافتہ جبکہ ایک قسم کے کفار کو جہنمی قرار دیا۔ نجات یافتہ کفار کی پہلی قسم ان کفار کی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دوسرے براعظموں میں آباد تھے جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ نجات یافتہ کفار ہی کی دوسری قسم ان کفار کی ہے جن کو دعوت صحیح طریقہ سے نہیں پہنچی اور اس بلوغِ دعوت میں اتمام حجت کی شرائط مفقود تھیں۔ البتہ وہ کفار جن تک دعوت صحیح طریقہ اور کامل شرائط کے ساتھ پہنچی لیکن انہوں نے تکبر وعناد کی وجہ سے اس پیغامِ دعوت میں غور وفکر نہیں کیا تو ایسے کفار کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

---

1 ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين، طريق الهجرتين وباب السعادتين (القاهرة: دار السلفية)، 1: 413.

Ibn Qayyim, Muhammad ibn Abi Bakr ibn Ayyub ibn Sa'd Shams al-Din, Tariq al-Hijratayn wa Bab al-Sa'adatayn, (al-Qahira: Dar al-Salafiyyah), 1:413.

نے اہل جہنم میں شمار کیا۔[1] چونکہ اہل فترۃ تک بھی پیغامِ نبوت ورسالت نہیں پہنچا ہوتا لہٰذا اس قانونِ اتمامِ حجت کی روسے اہل فترۃ بھی نجات یافتہ قرار پاتے ہیں۔ تاہم یہ استثناء عذاب سے ہے، کفر سے استثناء نہیں ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جو شخص بھی اعتقاداتِ کفریہ یا اعمالِ کفریہ کا حامل ہوگا اس کو ضرور کافر قرار دیا جائے گا، اب اگر اس پر اتمامِ حجت ہو چکا ہوا تو عذاب بھی ہوگا ورنہ کفر معاف ہوگا اور عذاب نہیں ہوگا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں وحدتِ ادیان کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے اعتقادات واعمال کفریہ کے سبب کافر ضرور گردانا جائے گا۔ لیکن دورِ حاضر میں انسانوں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر پائے جانے والی تقسیم واختلافات کو ختم کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجہ میں وحدت ادیان کا تصور بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانے لگا ہے۔ اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ مذہب انسان کی ایجاد و اختراع ہے اور چونکہ مذہب کی بنیاد پر پائے جانے والی اس تقسیم سے دنیا میں جنگ وجدال اور قتل وغارت کا بازار گرم ہے لہٰذا اس کے سدِباب کے لیے ضروری ہے کہ مذاہب کے درمیان ایسی موافقت ومطابقت پیدا کی جائے کہ اختلافات ونزاعات کا یہ سلسلہ اختتام پذیر ہو اور ایک ایسا مشترکہ دین تیار کیا جائے جو اقوامِ عالم کے لیے قابلِ قبول ہو۔ وحدت ادیان کے نظریہ نے تمام ادیان کو قابلِ عمل اور تمام ادیان کے متبعین کو نجات یافتہ قرار دیا۔ اس نظریہ کے مطابق حق کسی ایک دین میں منحصر نہیں رہتا بلکہ کسی بھی دین کی پیروی کی صورت میں دخولِ جنت کا امکان باقی رہتا ہے۔[3] اس نظریہ کی بابت ایک اشتباہ قرآن مجید کی سورہ بقرۃ کی ایک آیت سے پیدا ہوتا ہے جس

---

1 محمد رشيد بن علي رضا، تفسير المنار (مصر: الهيئة المصرية العامة للكتاب، 1990م)، 1: 280.
Muhammad Rashid bin Ali Rida, Tafsir al-Manar, (Misr: Al-Hay'ah al-Masriyyah al-'Amah lil-Kitab, 1990m), 1:280.

2 ابن قيم، محمد بن أبي بكر، طريق الهجرتين، 1:414.
Ibn Qayyim, Muhammad ibn Abi Bakr, Tariq al-Hijratayn,1: 414.

3 سبز علی خان، عصر حاضر میں وحدت ادیان کا تصور اور اسلامی نکتۂ نظر (التفسیر، جلد 13، شمارہ 34، دسمبر 2019ء)، ص: 191۔
Sabz Ali Khan, "Asr-e-Haazir Mein Wahdat-e-Adyan Ka Tasawwur aur Islami Nukta-e-Nazar" (Tafsir, Vol. 13, Issue 34, December 2019 ,P: 191

میں محض اللہ ویوم آخرت پر ایمان اور اعمالِ صالحہ کو مدار نجات قرار دیا گیا ہے، اور اس آیت میں آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر ایمان لائے بغیر خوف وحزن سے آزادی کی بشارت دی گئی ہے جس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے ادیانِ منسوخہ کے پیروکار بھی اس بشارت کے حقدار ہیں اور انہیں آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر ایمان لانے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ انہیں اہلِ فترۃ کے ساتھ ملحق کر کے نجات یافتہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ ہٰذا میں سورۂ بقرۃ کی اسی آیت کی تفسیر و تشریح اور اس آیت سے پیدا ہونے والے اشتباہ کا ازالہ کیا گیا ہے۔

تحقیق کے بنیادی سوالات

ہماری اس مختصر تحقیق کا بنیادی سوال یہ ہے کہ

- کیا عصرِ حاضر کے یہود و نصاریٰ کو اہل فترۃ کے ساتھ ملحق قرار دیتے ہوئے نجات کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے؟
- قرآن مجید کی اُن آیات کے پیشِ نظر جن میں محض توحید وآخرت پر ایمان کی صورت میں جنت کی بشارت ہے عصرِ حاضر کے یہود ونصاریٰ کو نجات یافتہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

سابقہ تحقیقات

وحدتِ ادیان کا تصور کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ اس کے آثار عہدِ رسالت میں بھی ملتے ہیں، جب مشرکین نے آپ ﷺ کو درخواست پیش کی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودان کی پرستش کریں تو ایک سال ہم آپ ﷺ کے معبود کے حضور سر بسجود ہو جائیں گے۔ اس کی تردید اللہ نے سورہ کافرون کے ذریعہ نازل فرمائی۔[1] علامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "هداية الحيارى في أجوبة اليهود والنصارى" کے نام سے لکھ کر نسخ یہودیت و عیسائیت کو بیان فرمایا۔ لیکن عصرِ حاضر میں "مکالمہ بین المذاہب" اور "بین المذاہب ہم آہنگی" وغیرہ کے عنوانات سے جب اس نظریہ کی پھر سے ترویج کی کوشش کی گئی تو ایک بار پھر اس نظریہ کی تردید میں علامہ بکر بن

---

1 ابن كثير، إسماعيل بن عمر، تفسير القرآن العظيم (رياض: دار طيبة للنشر والتوزيع، 1420ھ)، 7:507.

Ibn Kathir, Isma'il ibn 'Umar, Tafsir al-Qur'an al-'Athim, (Riyadh: Dar Tayyiba lil-Nashr wal-Tawzi', 1420 AH),7: 507.

عبد اللہ نے "الإبطال لنظرية الخلط بين دين الإسلام وغيره من الأديان" کے نام سے کتاب لکھی۔ اسی طرح محترم سبز علی خان نے ایک مقالہ بعنوان "عصرِ حاضر میں وحدت الادیان کا تصور اور اسلامی نکتہ نظر" لکھا جو مجلہ "التفسیر" کی جلد 13 کے شمارہ نمبر 34 میں شائع ہوا۔ البتہ راقم نے سورہ بقرہ کی جس آیت پر بحث کی ہے مندرجہ بالا علمی ذخیرہ اس سے خالی ہے۔

اہلِ فترۃ کی تعریف

بحث کے باقاعدہ آغاز سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "فترۃ" اور "اہلِ فترۃ" کے لغوی و اصطلاحی مفہوم سے آگاہی حاصل کر لی جائے "فترۃ" کا مادہ "ف، ت، ر" ہے جس کے لغوی معنی ضعف و سکون وغیرہ کے ہیں مشہور کتاب "مختار الصحاح" میں اس لفظ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"(الْفَتْرَةُ) الِانْكِسَارُ وَالضَّعْفُ. وَقَدْ (فَتَرَ) الْحَرُّ وَغَيْرُهُ مِنْ بَابِ دَخَلَ وَ (الْفَتْرَةُ) مَا بَيْنَ الرَّسُولَيْنِ مِنْ رُسُلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ. وَطَرْفٌ (فَاتِرٌ) إِذَا لَمْ يَكُنْ حَدِيدًا." [1]

"فترۃ کے معنی انکسار، ضعف اور کمزوری کے ہیں جب گرم چیز ٹھنڈی ہو جائے یا گرم موسم ٹھنڈا ہو جائے تو کہا جاتا ہے فَتَرَ الحرُّ۔ اسی طرح جب دھار تیز نہ ہو تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: "طرَف فاتر" یعنی کند دھار۔ اور فترۃ سے مراد وہ زمانہ ہے جو دو رسولوں کے درمیان ہو۔"

صاحبِ روح المعانی نے "فترۃ" کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"والفترة فعلة من فَتَرَ عن عمله، يفترُ فتورًا إذا سَكَن، والأصل فيها الإنقطاع عما كان عليه من الجد في العمل، وهي عند جميع المفسرين إنقطاع ما بين الرسولين." [2]

"فترۃ کا لفظ لغوی طور پر اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی عمل میں شدت کے بعد ضعف و

---

1 الرازي، محمد بن أبي بكر، مختار الصحاح (بيروت: دار الكتب العلمية، 1420ھ)، 7:507.
Al-Razi, Muhammad ibn Abi Bakr, Mukhtaar al-Sahah, (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah, 1420 AH), 7:507

2 آلوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله، روح المعاني، (بيروت: دار الكتب العلمية)، 3:274.
Alusi, Shahab al-Din Mahmud ibn Abdullah, Rawh al-Ma'ani, (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah), 3:274.

سکون آجائے۔ اصطلاحی طور پر تمام مفسرین کے نزدیک فترۃ سے مراد دو رسولوں کے درمیان انقطاعِ نبوت کا زمانہ ہے۔"

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تفسیر میں دو نبیوں کے درمیانی زمانہ کو فترۃ کا زمانہ کہنے کی وجہ اس طرح بیان کی ہے:

"وَسُمِّيَتِ الْمُدَّةُ الَّتِي بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ فَتْرَةً لِفُتُورِ الدَّوَاعِي فِي الْعَمَلِ بِتِلْكَ الشرائع"[1]

"جس زمانہ میں انبیاء مبعوث نہ ہوں اس زمانہ کو بھی اسی وجہ سے زمانہِ فترۃ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اعمالِ صالحہ میں کمی آجاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کی برکت سے نیک اعمال میں جو شدت پیدا ہوتی ہے وہ ماند پڑ جاتی ہے۔"

التفسیر الوسیط میں اہل الفترۃ کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

"وأهل الفترة وأهل الفترة كل من كان بين رسولين، ولم يكن الأول مرسلا إليهم، ولم يدركوا الثاني"[2]

"اہل الفترۃ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دو انبیاء کے زمانہِ نبوت کے درمیان ہوں اور پہلے نبی ان کی طرف مبعوث نہ ہوں جبکہ دوسرے نبی کا زمانہ انہوں نے نہ پایا ہو۔"

"معجم لغۃ الفقہاء" میں "فترۃ" اور "اہل الفترۃ" دونوں کی تعریف موجود ہے:

"الفترة: المدة بين زمنين، أو حادثتين أو نحو ذلك...Period

أهل الفترة: الناس الذي أوجدهم الله تعالى من بعد عيسى عليه السلام إلى مبعث رسول الله صلى الله عليه وسلم، وماتوا قبل البعثة"[3]

---

1 رازي، محمد بن عمر، مفاتيح الغيب (بيروت: دار إحياء التراث العربي)، 11:330.
Razi, Muhammad ibn 'Umar, Mafatih al-Ghayb, (Beirut: Dar Ihya al-Turath al-Arabi), 11:330.

2 مجموعة من العلماء، التفسير الوسيط للقرآن العظيم، 5:735.
Majmu'at min al-'Ulama', Tafsir al-Wasit lil-Qur'an al-'Athim, (Al-Hay'ah al-'Amah li-Shu'un al-Matba'at al-Amiriyyah), 5:735.

3 قلجي، محمد رواس حامد صادق، معجم لغة الفقهاء (بيروت: دار النفائس، 1988م)، ص: 339.
Qalaji, Muhammad Ruwas Hamid Sadiq, Mu'jam Lughat al-Fuqaha' (Beirut: Dar al-Nafa'is,

”دو مخصوص حادثات وواقعات کے درمیان کے اوقات کو زمانہِ فترۃ کہا جاتا ہے اور اہل الفترۃ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پیدا فرمایا اور وہ آخری نبی کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات و تصریحات سے ”فترۃ“ اور ”اہلِ فترۃ“ کا مفہوم خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اہلِ فترۃ کا لغوی واصطلاحی مفہوم جان لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ادیان سابقہ کے متبعین میں کون کون اہلِ فترۃ کی تعریف وحکم میں داخل ہے۔

اہلِ فترۃ کی تعیین

فتح الباری میں ایک حدیث:

" ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الكِتَابِ، آمَنَ بِنَبِيِّهِ"[1]

”تین اشخاص ایسے ہیں جو دوہرے اجر کے حقدار ہیں ایک وہ شخص جو اپنی نبی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔“

کے تحت اہل الفترۃ کی تعیین کے متعلق بحث کی گئی ہے۔[2]

جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض حضرات نے حدیث کے لفظ ”اہل الکتاب“ میں کتاب سے خاص کتاب ”انجیل“ مراد لی ہے یعنی صرف انجیل کے پیروکار دوہرے اجر کے حقدار ہیں اور تورات کے متبعین اس فضیلت میں شامل نہیں ہیں اس لیئے کہ مسیحیت، یہودیت کے لیئے ناسخ ہے لہٰذا جو مسیحیت کے بعد بھی یہودیت پر قائم رہا تو چونکہ وہ ایک منسوخ دین کی اتباع وپیروی کرتا رہا لہٰذا اس کو دوہرے اجر کی فضیلت حاصل نہیں ہو گی۔

1988 AD), p. 339.

1 البخاري، محمد بن اسماعيل، صحيح البخاري (قاهرة: دار طوق النجاة، 1422ھ)، 31:1، رقم 97.
Al-Bukhari, Muhammad ibn Ismail, Sahih al-Bukhari (Cairo: Dar Touq al-Najah, 1422 AH), 31:1, Hadith number 97.

2 العسقلاني، أحمد بن علي، فتح الباري (بيروت: دار المعرفة، 1379ھ)، 190:1.
Al-Asqalani, Ahmad ibn Ali, Fath al-Bari (Beirut: Dar al-Ma'arifah, 1379 AH), 1:190.

علامہ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوہرے اجر کے استحقاق کے لیئے نسخِ یہودیت کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلا خلاف بنی اسرائیل ہی میں مبعوث ہوئے تھے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا ان کا انتساب عیسائیت و مسیحیت کی طرف ہونے لگا اور بنی اسرائیل میں سے جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لایا اور یہودیت پر قائم رہا وہ مندرجہ بالا حدیث میں شامل ہی نہیں کیونکہ حدیث کے الفاظ "آمن بنبیه " ہیں جس کا مطلب اپنے نبی پر ایمان لانا ہے اور ایسے یہود اپنے نبی یعنی عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے لہٰذا وہ دوہرے اجر کے مستحق نہیں ہوں گے۔ البتہ وہ لوگ جو بنی اسرائیل میں سے نہ تھے اور انہوں نے یہودیت کو قبول کر لیا تھا تو ان پر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا لازم نہیں تھا کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں سے بھی نہیں جبکہ عیسیٰ علیہ السلام غیرِ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہی نہیں ہیں تو ایسے لوگ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے۔ نیز وہ یہودی بھی دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے جو بنی اسرائیل میں سے ہیں لیکن ان کو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت نہیں پہنچی تو اس پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ وہ"آمن بنبيه" ہے پس ایسے یہودیوں میں سے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد کسی نبی کی تکذیب نہ کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو دوہرے اجر کا مستحق ہو گا۔ لہٰذا یمن کے وہ عرب جنھوں نے یہودیت اختیار کی اور عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کو نہ پہنچی وہ بھی حدیثِ ذیل کی فضیلت میں شامل ہوں گے۔

علامہ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

1. عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد یہود "اہل الفترۃ" میں داخل نہیں۔
2. غیرِ بنی اسرائیل جنھوں نے یہودیت کو قبول کیا بعثتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی "اہل الفترۃ" میں شامل ہیں۔
3. وہ یہودی بھی "اہل الفترۃ" میں داخل متصور ہوں گے جن تک عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت نہ پہنچی ہو۔
4. وہ تمام لوگ بھی "اہل الفترۃ" میں داخل ہیں جن تک کسی بھی زمانہ میں کسی بھی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔

رسالتِ محمدیہ ﷺ کی بابت نصاریٰ کا عقیدہ

اب تک کی بحث سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد کون کون "اہل الفترۃ" میں شمار ہوتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ بعثتِ محمدیہ ﷺ کے بعد یہود و نصاریٰ کو "اہل الفترۃ" کے ساتھ لاحق کر کے دینِ موسوی و عیسوی پر عمل پیرا ہونے کی رخصت دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ دینِ موسوی و عیسوی پر موجودہ دور میں عمل پیرا ہونے کی گنجائش اور اس کے نتیجہ میں امکانِ نجات سے متعلق بحث کا آغاز کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود یہودیت وعیسائیت کا آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے متعلق نظریہ و عقیدہ معلوم کر لیا جائے۔ علامہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی وضاحت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب ہے کہ آپ ﷺ صرف عرب کے لیے نبی ہیں اور آپ ﷺ کی بعثت صرف عرب کے لیے ہے، غیرِ عرب کے لیے آپ ﷺ کی بعثت و رسالت نہیں ہوئی۔[1] علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نصاریٰ کا یہی مذہب لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "فهؤلاء القوم في هذا المقام ادعوا أن محمدا ﷺ لم يرسل إليهم بل إلى أهل الجاهلية من العرب "[2]
>
> یعنی نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت نصاریٰ کے لیے نہیں ہوئی بلکہ آپ ﷺ صرف عرب کے جہلاء کے لیے نبی بن کر آئے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نصاریٰ کا یہ قول بدیہی البطلان ہے کیونکہ اپنے اسی قول میں نصاریٰ نے

---

1 غزالي، محمد بن محمد، الاقتصاد في الاعتقاد (بيروت: دار الكتب العلمية، 1424ھ)، 1:114.
Al-Ghazali, Muhammad ibn Muhammad, Al-Iqtisad fi al-I'tiqad (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah, 1424 AH), 1:114.

2 ابن تيمية، أحمد بن عبد الحليم، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح (الرياض: دار العاصمة، 1414ھ)، 1:130.
Ibn Taymiyyah, Ahmad ibn Abdul-Halim, Al-Jawab Al-Sahih liman baddala Din al-Masih (Riyadh: Dar al-Asimah, 1414 AH), 1:130.

آپ ﷺ کا نبی بر حق ہونا(اگرچہ ایک مخصوص قوم کے لیے) تسلیم کر لیااور یہ بات بھی مسلم ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بولتا، اور خود آپ ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے آپ کو عرب و عجم اور اسود و احمر کے لیے مبعوث ہونے کو اپنی خصوصیت قرار دیا۔[1] اور غیرِ عرب کو بھی اپنی ذات پر ایمان لانے کی دعوت دی اور متعدد غیرِ عرب امراء و سلاطین کو اپنے دعوتی خطوط ارسال فرمائے۔ تو نصاریٰ کا ایک طرف آپ ﷺ کو محض عرب کے لیے نبیِ بر حق تسلیم کرنا اور دوسری طرف آپ ﷺ کے ان دعاوی کا انکار کرنا جن سے آپ ﷺ کا عرب و عجم کے لیے مبعوث ہونا ظاہر ہوتا ہے تناقض ہے۔

رسالتِ محمدیہ ﷺ کی بابت یہود کا عقیدہ

یہود کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی بھی طرح بر حق نبی نہیں ہیں اور نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت اور معجزات کا انکار کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی انکار کیا اور یہود کا یہ دعویٰ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور اس بارے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہود کے دو دلائل ذکر کیے ہیں۔[2]

اول یہ کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کو مبعوث کرنے سے پہلی شریعت کا نسخ لازم آتا ہے اور نسخِ شرائع محال و ناممکن ہے کیونکہ ایک حکم کو ختم کر کے دوسرا حکم اس کی جگہ اس لیے متعارف کرایا جاتا ہے کہ حکم دینے والے کو پتہ نہیں تھا کہ اس حکم کے کیا اثرات مرتب ہوں گے، بعد میں اس حکم کو نافذ کرنے کے مضر اثرات ظاہر ہوتے ہیں تو پہلے حکم کو ختم کر کے نیا حکم دیا جاتا ہے اور اللہ کی ذات سے چونکہ یہ بعید ہے کہ اللہ کو کسی حکم پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کا علم نہ ہو لہٰذا اللہ کے احکام میں نسخ بھی محال ہو گا۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ نسخِ شرائع یہود کے نظریہ کے مطابق ناممکن ہے۔[3]

---

1 البخاري، محمد بن إسماعيل، الجامع الصحيح، رقم الحديث: 438.

Al-Bukhari, Muhammad ibn Ismail, Al-Jami' Al-Sahih, Hadith number 438

2 غزالي، الاقتصاد في الاعتقاد، 1:11.

Ghazali, Al-Iqtisad fi Al-I'tiqad, 1:11.

3 رازي، مفاتيح الغيب، 3:63.

Razi, Mafatih al-Ghayb, 3:63.

یہود کے اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ یہود کو نسخ کی حقیقت کے فہم وادراک میں غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے نسخ کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ علامہ دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ نسخ کی حقیقت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

قرآن کے بعض احکامِ قانون کے نسخ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز و قانون آفریں کے قلم سے عین وضعِ قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی وہنگامی حیثیت رکھتے ہیں بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ مستقل ودوامی قوانین نے لے لی۔[1]

یعنی نسخ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایسا خطاب جو کسی ایسے حکم کا ارتفاع ثابت کرتا ہو جو حکم بظاہر دوام و استمرار کے ساتھ ثابت ہے۔ اس تعریف کے مطابق نسخ احکامِ شرع میں محال و ناممکن نہیں بلکہ کثیر الوقوع ہے، نسخ کی حقیقت کی مثال ایسے ہے کہ کوئی آقا اپنے غلام کو کھڑا ہونے کا حکم دے اور مدتِ قیام کا اظہار نہ کرے تو یہ حکم بظاہر دائمی ہے، لیکن آقا کے ذہن میں پہلے سے یہ بات طے شدہ ہے کہ غلام کو کب تک کھڑا رکھنا قرینِ مصلحت ہے، البتہ آقا، غلام کو اس پر متنبہ نہیں کرتا اور غلام یہی سمجھتا ہے مجھے ہمیشہ کے لیے کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا ہے، جب آقا کی طرف سے بیٹھنے کا حکم صادر ہوتا ہے تو آقا کے بارے میں یہ تصور و گمان نہیں کیا جاتا کہ آقا سے کوئی بھول ہو گئی تھی یا اب کسی نئی مصلحت کا ظہور ہوا جس کی بناء پر آقا نے بیٹھنے کا حکم دیا اور یہ مصلحت پہلے سے آقا کے علم میں نہیں تھی بلکہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ آقا کے علم میں پہلے سے یہ بات طے تھی کہ غلام کو کس وقت تک کھڑا رکھنا قرینِ مصلحت ہے لیکن کسی حکمت کی بناء پر اس مدتِ قیام پر غلام کو مطلع کرنا مناسب نہیں تھا اور غلام کو وقت بتائے بغیر قیام کا حکم دینا بہتر تھا۔

شرائع کا اختلاف بھی اسی طرح ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی نئے حکم کا آنا "علم بعد الجہل" پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی تناقض پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے ایک حکم دیا گیا اور بعد میں اس کے مناقض حکم دے دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ کی مصلحت کے پیشِ نظر ایک حکم دیا گیا اور جب مرورِ زمانہ کے ساتھ مصلحت تبدیل

---

1 دریابادی، عبد الماجد، تفسیر ماجدی، (لاہور: پاک کمپنی اردو بازار، س۔ن)، ص:55

Daryabadi, Abdul Majid, Tafsir Majidi (Lahore: Pak Company Urdu Bazar, n.d :P: 55

ہو گئی تو دوسرا حکم دے دیا گیا۔[1]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نسخ کے محال و ناممکن ہونے سے نبوتِ محمدیہ کے انکار پر استدلال تب صحیح ہو سکتا تھا جب خود یہود کا یہ نظریہ و اعتقاد ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کر موسیٰ علیہ السلام تک کوئی شریعت نہیں آئی اور کسی شریعت کا نسخ واقع نہیں ہوا، حالانکہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کئی انبیاء علیہم السلام کی نبوت و رسالت کو تسلیم کیا ہے، نوح و ابراہیم کے وجود کا انکار کیا اور نہ ان کی شرائع کا انکار کیا تو معلوم ہوا کہ نسخِ شرائع کا تصور خود یہود میں بھی پایا جاتا ہے اور اب نسخ کے محال ہونے کا قول صرف نبوتِ محمدیہ سے انکار کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کرنے کے لیے یہود کا دوسرا استدلال جس کا تذکرہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "عليكم بديني ما دامت السمٰوٰت والأرض" کہ جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے تم پر میرے دین پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسی طرح یہود کا کہنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خاتم النبیین ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔ لہٰذا جب موسیٰ علیہ السلام کا دین ہمیشہ کے لیے ہے اور موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین ہیں تو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہود کے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر معجزات کا ظہور نہ ہوتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر معجزات کا ظہور عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق من جانب اللہ ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ ایسے شخص کی تصدیق بذریعہ معجزات فرمائیں جو (بزعم یہود) موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے والا ہو، جب یہود خود عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا اقرار کرتے ہیں اور معجزات سے تصدیقِ رسالت کا علم حاصل ہوتا ہے تو اس سے یہود کے اس دعویٰ کی تکذیب لازم آتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خاتم الانبیاء علیہم السلام ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

اس شبہ کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام کے خاتم الانبیاء ہونے کا قول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے

1 غزالي، الاقتصاد في الاعتقاد، 1:114.

Ghazali, al-Iqtisad fi al-I'tiqad, 1:114

بعد اختیار کیا ہے اگر یہ بات صحیح ہوتی تو آپ ﷺ کے زمانہ میں ہی یہودی اس سے استدلال کرتے۔ لیکن روایات سے یہ بات تو ثابت ہے کہ یہودیوں نے آپ ﷺ کے خلاف سازشیں کیں، تلوار اٹھائی، قتال کیا لیکن یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہودیوں نے آپ ﷺ کے زمانۂ نبوت میں یہ دعویٰ کیا ہو کہ موسیٰ علیہ السلام آخری نبی تھے۔ شاید یہودیوں کو خود بھی اس دعویٰ کے بطلان کا علم تھا ورنہ تلوار اٹھانے، قتل و قتال کرنے اور ملک بدر ہونے کی بنسبت یہ بڑا آسان کام تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کر لیا جاتا۔

نسخِ یہودیت وعیسائیت کی بابت ایک اشتباہ کا ازالہ

قرآن مجید کی ایک آیت سے اخروی نجات کا دار و مدار محض تین چیزیں (اللہ پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان اور نیک اعمال) معلوم ہوتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[1]

"جو لوگ (ظاہری طور پر) مانتے ہیں یا جو لوگ یہودی ہیں یا عیسائی یا بے دین جو کوئی ان میں سے اللہ کو دل سے مانے اور قیامت کے دن کا یقین کرے اور عمل اچھے کرے پس ان کی مزدوری ان کے مالک کے پاس ہے اور نہ ان کو خوف ہے اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔"

چونکہ یہود و نصاریٰ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیز ان میں نیکوکار بھی ہیں تو اس آیت سے ان کی نجات کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے اور وحدتِ ادیان کا نظریہ تقویت پانے کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہودیت وعیسائیت اب بھی قابلِ عمل ادیان ہیں؟ کیا ان کے ذریعہ بھی نجات ممکن ہے؟ کیا رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں؟ اس لیے آئندہ سطور میں اس آیت کی تفسیر و تشریح کے ساتھ ساتھ نسخِ یہودیت و عیسائیت کی بابت پیدا ہونے والے اس اشکال کا دفعیہ کیا گیا ہے۔

---

1 البقرۃ:62

Al-Baqarah:62

تفسیر و تشریح: اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف واقع ہوا ہے اور مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ وجہ اختلاف یہ ہے کہ آیت کی ابتدا میں اہلِ ایمان کا ذکر کیا گیا اور آخرِ آیت میں ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، دوبارہ ایمان کا لفظ ذکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان کے پہلے اور دوسرے لفظ کی مراد الگ الگ ہے، نیز اس آیت کا مفہوم اس وجہ سے بھی محلِ نزاع ہے کہ اس آیت میں مؤمنین کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور صابئین کو بھی عدمِ خوف و حزن کی بشارت سنائی گئی ہے۔

متعدد مفسرین نے اس آیت میں سابقہ ادیان کی اتباع و پیروی کی صورت میں اس بشارت کے حصول کو ان ادیان کے منسوخ ہونے سے پہلے کے زمانہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 502ھ) فرماتے ہیں کہ ایمان کا لفظ دو معانی میں استعمال ہوتا ہے پہلا معنیٰ "شہادتین کا اقرار" ہے اس کی بدولت انسان کا جان و مال محفوظ ہوتا ہے اور اس معنیٰ کا حصول دینِ اسلام کے ساتھ خاص ہے یعنی جو شخص بھی زبان سے کلمۂ طیبہ کا اقرار کرلیتا ہے دنیاوی طور پر وہ امن پالیتا ہے۔ جبکہ دوسرا معنیٰ دین کے معاملات میں یقین کی تحری ہے۔ آیتِ زیرِ بحث میں پہلے ایمان سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے دینِ اسلام کو قبول کیا اور شہادتین کا اقرار کرلیا اور دوسرے ایمان سے مراد اعتقادِ یقینی کی تلاش و جستجو ہے کہ محض زبان سے اقرار کرنے کے بعد وہ اسی پر اکتفاء کرکے نہیں بیٹھ گئے بلکہ ایمان میں بلند درجات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے تو ان پر کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ چار ادیان مشہور ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ واضح فرمایا کہ ان چار ادیان کی مشروعیت کے وقت اور ان کے منسوخ ہونے سے پہلے جس شخص نے بھی ان ادیان میں سے کسی دین کا زبان سے اقرار کیا اور اعتقادِ یقینی کی تتبع و جستجو میں رہا نیز اپنے اعتقادات کے ساتھ اعمالِ صالحہ کو ملایا تو ان پر کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یعنی اس آیت میں سابقہ ادیان کے متبعین کے لیے جو بشارت ہے یہ صرف اس زمانہ تک ہے جب تک وہ ادیان منسوخ نہیں ہوئے جب بعثتِ محمدی کے ساتھ وہ ادیان منسوخ ہو گئے تو اب یہ بشارت حاصل نہیں ہوگی۔[1]

---

1 أصفهاني، حسين بن محمد، تفسير الراغب (كلية الآداب، 1420ه)، 1:214.
Ashfahani, Husain bin Muhammad, Tafsir al-Raghib (College of Adab, 1420 AH), 1:214.

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 685ھ) فرماتے ہیں کہ پہلے "آمنوا" سے مراد مؤمنین و منافقین دونوں ہیں اور دوسرے "اٰمن" سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی اپنے دین پر اس دین کے منسوخ ہونے سے پہلے عمل پیرا رہا اور مبدأ و معاد پر بھی اس کو اعتقادِ قلبی حاصل تھا نیز شریعت کے مقتضیات پر بھی عمل کرتا رہا تو اس کے لیے نہ خوف ہو گا نہ حزن۔[1]

علامہ ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 542ھ) نے اس کی چار تفسیریں کی ہیں، پہلی تفسیر یہ کہ "اٰمنوا" سے مراد منافقین ہیں یعنی وہ لوگ جو ظاہری طور پر ایمان لائے اور اسی وجہ سے ان کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، پھر ان سب گروہوں کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ جو بھی ان میں سے خالص ایمان لائے گا تو اس کے لیے اجر و ثواب ہو گا، اس تفسیر کے مطابق "من اٰمن" کے الفاظ جب منافقین کے متعلق ہوں گے تو اس سے مراد اخلاص سے ایمان لانا ہو گا اور جب یہی الفاظ یہود و نصاریٰ کے متعلق ہوں گے تو اس سے مراد "دخول فی الاسلام" ہو گا، یعنی منافقین کو یہ بشارت تب حاصل ہو گی جب وہ اخلاص کے ساتھ ایمان لائیں گے اور یہود و نصاریٰ کو اس وقت جب وہ اسلام کو قبول کریں گے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "اٰمنوا" سے مراد مخلص مؤمنین ہیں لیکن "من اٰمن" سے مراد اسلام میں داخل ہونا نہیں ہے کیونکہ وہ تو پہلے سے اسلام میں داخل ہیں، بلکہ اس سے مراد اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے یعنی مخلص مؤمنین کو بھی یہ بشارت اسی وقت حاصل ہو گی جب وہ مرتے دم تک اسلام پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

تیسری تفسیر علامہ اندلسی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی یہ فرماتے ہیں کہ "اٰمنوا" سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعثتِ محمدی سے پہلے صحیح دینِ ابراہیمی پر قائم تھے اور انہوں نے شرک سے اجتناب کیا مثلاً زید بن عمرو بن نفیل، قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل وغیرہ اور "ھادوا" سے بھی اسی طرح وہ یہودی مراد ہوں گے جو بعثتِ محمدی سے پہلے دینِ ابراہیمی پر قائم تھے البتہ وہ یہودی اس بشارت کے استحقاق سے خارج ہوں گے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب

---

1 بيضاوي، عبد الله بن عمر، أنوار التنزيل وأسرار التأويل (بيروت: دار إحياء التراث العربي، 1418ھ)، 1:84.

Baydawi, Abdullah bin Umar, Anwar al-Tanzil wa Asrar al-Ta'wil (Beirut: Dar Ihya al-Turath al-Arabi, 1418 H), 1:84.

کی، اور نصاریٰ سے مراد بھی صرف وہی نصاریٰ ہوں گے جو دینِ صحیح پر قائم تھے اور انہوں نے آپ ﷺ کا زمانہ نہیں پایا تو ان سب میں سے جن کا بھی اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان تھا تو ان کے لیے یہی بشارت ہو گی۔

چوتھی تفسیر اس آیت کی حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے یہ ہے کہ یہ آیت ابتداءِ اسلام میں نازل ہوئی اور اس وقت یہی حکم تھا کہ جو شخص آپ ﷺ پر ایمان لائے یا سابقہ ادیان پر ایمان لائے جب ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت حاصل ہو گا تو نجات کے لیے یہی کافی ہے بعد میں اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا اور اللہ نے نبوتِ محمدی پر ایمان لانے کو لازم قرار دے دیا اور دینِ محمدی کے علاوہ کسی اور دین کی قبولیت سے انکار فرما دیا۔[1]

ان تمام تفاسیر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی مفسر نے زمانۂ موجودہ کے یہود و نصاریٰ کو اس آیت کے مفہوم میں داخل فرما کر ان کو نجات یافتہ قرار نہیں دیا بلکہ اس آیت کے مفہوم کو ادیانِ سابقہ کی مشروعیت کے زمانہ کے ساتھ مقید رکھا ہے۔ مزید برآں کئی ایسے قرآنی استشہادات و دلائل ہیں جو اس آیت کے صحیح معنیٰ و مفہوم کو متعین کرتے ہیں، اگلی سطور میں ہم ایسے ہی چند دلائل کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ازالۂ اشتباہ

قرآن میں ہی کئی ایسے دلائل پائے جاتے ہیں جن سے وحدتِ ادیان کے نظریہ کا بطلان ہوتا ہے اور یہودیت و عیسائیت کے نسخ پر مہر ثبت ہوتی ہے، اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ کتاب کی نجات دین کا دار و مدار آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے اقرار میں مضمر ہے اس لیے آیت کی ابتدائی تفسیر و تشریح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اشتباہ کے ازالہ کی دیگر قرآنی وجوہات بھی ذکر کر دی جائیں۔

اول: غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عدمِ خوف و حزن کی بشارت کے جو الفاظ اس آیتِ قرآنیہ میں آئے ہیں یہی الفاظ قرآنِ مجید میں دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں اور ان مقامات کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا

---

1 ابن عطية، عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن، المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز (بيروت: دار الكتب العلمية)، 1:156.

Ibn 'Atiyyah, 'Abd al-Haq bin Ghalib bin 'Abd al-Rahman, Al-Muharrar al-Wajiz fi Tafsir al-Kitab al-'Aziz (Beirut: Dar al-Kutub al-'Ilmiyyah), 1:156.

ہے کہ یہ استدلال باطل ہے۔ ان میں سے پہلی آیت اسی سورۃ کی ہے جس میں ارشادِ باری ہے:

﴿بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[1]

"ہاں جو کوئی اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دے اور وہ نیکوکار ہو تو ان کی مزدوری ان کے مولا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہو گا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔"

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی رضا پہ راضی رہنا اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا انجام وہی ہے جو اس آیتِ زیرِ بحث میں بتایا گیا ہے یعنی عدمِ خوف و حزن۔ اس آیت میں اخروی نجات کے لیے تین شرائط کے بجائے صرف ایک شرط کو لازمی قرار دیا گیا اور وہ ہے اللہ پر ایمان۔ تو کیا ایسا شخص جس تک نبوت ورسالت کی دعوت اور شریعت کے احکامات کا علم پہنچ چکا ہو محض اللہ پر ایمان لانے اور نبوت وشریعت کی تکذیب کے باوجود جنتی قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح سورۂ بقرۃ میں ہی انہی الفاظ کا ایک اور انداز کے ساتھ اعادہ کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[2]

"جو لوگ شب وروز پوشیدہ اور ظاہر اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں موجود ہے نہ ان کو خوف ہے نہ غمناک ہوں گے۔"

اس آیت میں وہی بشارت اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے پر دی گئی اور عدمِ خوف و حزن کو محض انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق قرار دیا گیا کہ اپنے اموال کو دن ورات اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے عدمِ خوف و حزن کا پروانہ نصیب ہوتا ہے۔ تو کیا اس آیت سے یہ استدلال کرنا ممکن ہے کہ زیرِ بحث آیت میں جن تین چیزوں کو مدارِ

---

1 البقرۃ:112

Surah Al-Baqarah: 112

2 البقرۃ:274

Surah Al-Baqarah: 274

نجات قرار دیا گیا اب ان پر ایمان لانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں اور صرف انفاق فی سبیل اللہ سے اخروی سعادت حاصل ہو جائے گی؟ کیا اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص نے اپنا مال نیک کاموں میں خرچ کیا وہ جنت میں ہی جائے گا چاہے اس کا اللہ، یومِ آخرت پر ایمان ہو اور نہ ہی کوئی عملِ صالح ہو؟ ظاہر ہے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تو معلوم ہوا کہ ان آیات سے ظاہری طور پر جو مفہوم لیا گیا اور جو سرسری استدلال کیا گیا وہ صحیح نہیں۔ اگر دوسری آیت سے استدلال کر کے محض ایمان باللہ اور تیسری آیت سے استدلال کر کے صرف انفاق فی سبیل اللہ کو آخرت میں نجات کا دارومدار قرار نہیں دیا جا سکتا تو اسی پر قیاس کرتے ہوئے پہلی آیت سے استدلال کر کے صرف ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عملِ صالح کو مدارِ نجات قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں جن امور پر نجات موقوف ہے ان کا احاطہ نہیں کیا گیا اور وہ تمام امور نہیں بتائے گئے جن پر نجاتِ اخروی موقوف ہے بلکہ مختلف عناصر و اجزا کا الگ الگ مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے ایک آیت میں کچھ عناصر و اجزا کا ذکر کر دیا گیا اور دوسری آیت میں دیگر اجزا کا ذکر کر دیا گیا اور ایک آیت میں کسی ایک چیز کو نجات کا مدار قرار دینے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس کے ذریعہ دیگر امور کے مدارِ نجات ہونے کی نفی کر دی گئی ہے اور نجات اسی ایک جز میں منحصر کر دی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں صرف یہ بتایا گیا ہے نجاتِ اخروی ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، عملِ صالح اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ پر موقوف ہے لیکن کسی آیت کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے کہ نجات صرف ایمان باللہ یا صرف ایمان بالآخرت یا صرف انفاق فی سبیل اللہ پر موقوف ہے چاہے ان کے ساتھ دیگر کتنے ہی اعتقادات کی نفی، اوامر کا ترک اور نواہی کا ارتکاب پایا جا رہا ہو۔ نیز ان آیات میں سے کسی بھی آیت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر یہی انفاق فی سبیل اللہ یا یہی عملِ صالح ایمان باللہ یا ایمان بالآخرت کے بغیر ہو تو تب بھی یہ نجات کا سبب بنے گا یا نہیں۔

اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اس آیت کے سیاق وسباق کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کی اپنی خواہش کے پیشِ نظر میدانوں کی پاکیزہ آب وہوا اور قدرتی زندگی سے نکل کر شہروں کی گنجان اور کثیف وردی آب وہوا والی زندگی میں اترنے کا حکم دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ اس شہر کی متمدن زندگی میں تمہاری ان خواہشوں کی تکمیل ہو گی جن کا تم تقاضہ کر رہے ہو مگر قرآن نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس شہری زندگی میں تم ذلت ورسوائی کا شکار ہو جاؤ گے اس لیے کہ شہری زندگی میں دولت وثروت

میں انسانی مراتب میں اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ اکثر انسانوں کو دوسروں کے سامنے اپنی دولت ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی بتادیا گیا کہ شہری زندگی میں مال وجاہ، دولت وثروت کی وجہ سے عموماً انسان حدود اللہ پر قائم نہیں رہتا اور عصیان وسرکشی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ اللہ کا غضب ہے اس کے بعد زیرِ بحث آیت ہے جس میں یہ بتایا جارہا ہے کہ شہری زندگی میں عموماً گروہ بندی اور پارٹی بازی شروع ہو جاتی ہے اور مفاد پرست وچالاک لوگ کسی نہ کسی نقطۂ اشتراک پر سادہ لوح عوام کو اپنے ساتھ جمع کر لیتے ہیں، یہ نقطۂ اشتراک علاقائی، لسانی اور نسلی وغیرہ ہوتا ہے نیز کبھی کبھار اس گروہ بندی کے لیے مذہب کو بھی استعمال کیا جاتا ہے اس موقع پر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس شہری زندگی میں بھی مذہب کا صحیح استعمال کر کے انسان نجات حاصل کر سکتا ہے اور اگر مذہب کا غلط استعمال کیا گیا اور انہی مقاصد کے لیے مذہب کا بھی استعمال کیا گیا جن مقاصد کے لیے نسل ووطن اور زبان کا استعمال کیا جاتا ہے تو ایسا نام نہاد مذہب باعثِ نجات نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ کہ جن امور پر نجات موقوف ہے ان کے بعض ایجابی اجزاء کا اس آیت میں ذکر کر دیا گیا بالاستیعاب تمام اجزاء کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ تمام اجزاء کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے۔ قرآن میں ﴿لا خوف عَلَيهِم وَلَا هُم يَحزَنُون﴾ کا پہلا استعمال ہی ایمان بالرسالت کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے ارشادِ باری ہے:

﴿ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[1]

"پس اگر میری طرف سے تم کو ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کے تابع ہوں گے سو نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے۔"

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں نجات کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ اپنے انبیاء ورُسل کے ذریعہ اپنے بندوں کو اپنی مرضیات سے آگاہی دیتے رہیں گے جو ان انبیاء ورُسل کی اتباع وپیروی کرے گا نجات یافتہ ہوگا گویا کہ نجات کی پہلی شرط اس آیت کی رو سے ایمان بالرسالت ہی ہے۔

1 البقرۃ:38

Surah Al-Baqarah: 38

دوم: یہ آیت اس سورۃ میں وارد ہے جس کا مضمونِ اساسی ہی رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور قرآن پر ایمان لانا ہے اور اہلِ کتاب کو خصوصاً اس چیز کی دعوت دی گئی اور انہیں بالخصوص مخاطب کیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾[1]

"اور میری اتاری ہوئی کتاب کو مانو جو تمہارے ساتھ والی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور سب سے پہلے منکر نہ بنو اور میرے حکموں کے بدلے حقیر مال نہ لیا کرو فقط مجھ ہی سے ڈرو۔"

اس آیت میں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت اور قرآن پر ایمان نہ لانے کو صریح کفر قرار دیا گیا اور قرآن پر ایمان آپ ﷺ پر ایمان لائے بغیر ممکن ہی نہیں گویا اسی آیت میں ایمان بالرسالت کا حکم بھی ہو گیا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے بعد یہود و نصاریٰ کو قرآن اور آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لانے کی اجازت دے دی جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ ایمان بالرسالت کے بغیر بھی نجات ممکن ہے یہ تو صریح تضاد ہے اور تضاد تو کسی عام کلام میں بھی برا سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ قرآن میں تضاد کا قول اختیار کیا جائے۔

سوم: قرآن میں یہی الفاظ تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ سورہ مائدۃ میں بھی ہیں ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[2]

"مسلمان ہوں یا یہودی صابی ہوں خواہ عیسائی جو ان میں سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کو نہ تو خوف ہو گا نہ غمگین ہوں گے۔"

اس آیت کا سیاق وسباق بھی آیت زیرِ بحث کا مفہوم متعین کرنے میں مدد و معاون ہے اس آیت سے پہلے اہلِ کتاب سے اللہ کا خطاب ہے:

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ

---

1 البقرة:41

Surah Al-Baqarah: 41

2 المائدة:69

Surah Al-Ma'idah: 69

إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُم﴾[1]

"تو بھی کہہ دے اے کتاب والو! جب تک تم توریت اور انجیل پر اور جو تمہاری طرف اللہ کے ہاں سے اترا ہے اس پر پورا پورا عمل نہ کروگے تمہاری کوئی بات ٹھیک نہیں۔"

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو مطلع کیا گیا کہ ﴿وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ پر ایمان لائے بغیر تمہارا ایمان بالتوراۃ یا ایمان بالانجیل قابلِ قبول نہیں۔ اور انجیل و تورات کو قائم کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان کتب میں تمہیں جس نبی آخر الزماں کی بشارت دی گئی اس نبی پر ایمان لاؤ، کیونکہ قرآن پر ایمان لانے سے ہی اس عہد و پیمان کی پاسداری ہوتی ہے جو ان یہود و نصاریٰ سے آخری نبی پر ایمان لانے کا لیا گیا تھا اور یہود و نصاریٰ کو قرآن پر ایمان لانے کی صورت میں یہ اطمینان بھی دلایا گیا کہ اس وقت وہ جن دنیاوی منافع و نعم سے استفادہ کر رہے ہیں یہی منافع و نعم ان کے لیے ثابت و مستمر رہیں گے اور اہلِ کتاب اس اندیشہ میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ ان منافع سے محروم کر دیے جائیں گے۔

چہارم:

﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ﴾[2]

"اور ہمیں دنیا میں عافیت نصیب کر اور آخرت میں بھی یقیناً ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں اللہ نے کہا اپنا عذاب میں جس کو چاہوں گا پہنچاؤں گا اور میری رحمت سب چیزوں میں شامل ہے پس یہ رحمت میں ان کے نام کروں گا جو پرہیز گاری کرتے ہوں گے اور زکوۃ دیتے ہوں گے اور میرے حکموں کو مانتے ہوں گے۔"

---

1 المائدۃ:6۔

Surah Al-Ma'idah: 6

2 الأعراف:156۔

Surah Al-A'raf: 156

قرآنِ مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد اللہ کی رحمت کے مستحق وہی یہود ہوں گے جو نبی ﷺ پر ایمان لائیں گے اور جو یہود نبی ﷺ پر ایمان لانے سے رُوگردانی کریں گے وہ بجائے رحمت کے اللہ کی لعنت کے حقدار ہوں گے، جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے اللہ سے رحمت طلب کی تو اللہ نے اس رحم کو ان لوگوں کے ساتھ خاص فرمادیا جن میں تقویٰ ہوگا وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں گے آخرت پر ایمان لائیں گے اور جن کو نبی کریم ﷺ کا زمانہ ملے گا تو وہ نبی ﷺ پر بھی ایمان لائیں گے۔ تو اس آیت سے بھی یہود و نصاریٰ کے لیے محمد ﷺ پر ایمان کی فرضیت معلوم ہوتی ہے۔[1]

پنجم: مولانا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں اس استدلال کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تمام ایمانیات کو بیان نہیں کیا گیا، بلکہ سلسلۂ ایمانیات کی ابتداء و انتہاء کو ذکر کر دیا گیا اور باقی ایمانیات سب ان دونوں کے اندر داخل ہیں، سلسلۂ ایمانیات کی ابتدا اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے اور انتہاء یومِ آخرت پر ایمان کے ساتھ۔[2] اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾[3]

"وہ دونوں مشرقوں کا پروردگار ہے اور وہی دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔"

اس آیت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ محض مشرق و مغرب کا رب ہے کیونکہ آیت میں انہی دو جہات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں ان دو جہات کو ذکر کرنے کا مقصد انہی دو جہات میں حصر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان دو جہات میں جو کچھ ہے سب کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا آیتِ زیرِ بحث میں بھی ایمانیات کی یہی دو متعین

---

1 اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، 1985ء)، 236:1

Aslahi, Amin Ahsan, Tadabbur-e-Quran (Lahore: Faran Foundation, 1985), 1:236 .

2 کاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن، (شہداد پور، سندھ: مکتبہ المعارف)، 195:5

Kandhlovi, Muhammad Idris, Ma'arif al-Quran (Shahdadpur, Sindh: Maktabah al-Ma'arif), 5:195.

3 الرحمٰن: 17۔

Surah Al-Rahman: 17

چیزیں مراد نہیں ہوں گی، بلکہ جمیع ایمانیات مراد ہوں گی کیونکہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انبیاء وملائکہ پر ایمان نہ لایا جائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت اور آخرت کے احوال سے آگہی وحیِ الٰہی سے ہوتی ہے اور وحیِ الٰہی کے نزول کا ذریعہ ملائکہ ہی ہیں گویا جتنی بھی ایمانیات ہیں یہ ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں ایک چیز پر ایمان لانا دوسری چیز پر ایمان لانے کا مقتضی ہے۔

خلاصہِ بحث

ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح اہلِ کتاب کے علاوہ کفار کی نجات نبی ﷺ پر ایمان لانے پر موقوف ہے اسی طرح خود اہلِ کتاب کی نجات بھی آپ ﷺ پر ایمان لانے پر موقوف ہے بلکہ اہلِ کتاب پر تو نبی ﷺ پر ایمان لانا دیگر کفار کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ولازم ہے اس لیے کہ ان کتابوں اور صحائف سابقہ میں نیز ان کے انبیاء کی پیش گوئیوں میں نبی آخر الزماں کے مبعوث ہونے کی نہ صرف یہ کہ خبر دی گئی بلکہ اس نبی پر ایمان لانے کا عہد وپیمان بھی لیا گیا اور یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ جب اس نبیِ آخر الزماں کا اعلانِ نبوت سنو تو ایمان لانے کے ساتھ ساتھ تمہارا فرضِ منصبی یہ بھی ہے کہ ان کی مدد ونصرت بھی کروگے۔ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں نیک اہلِ کتاب کے متعلق تعریفی الفاظ ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس بناء پر ان کی نجات بھی ہو جائے گی بلکہ اس تعریف کی وجہ ان لوگوں کی حق پسندی کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا تھا اور پھر اسی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ سارے حق پرست اہلِ کتاب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ دیگر آسمانی کتب وصحائف کے بارے میں قرآن یہ ضرور تسلیم کرتا ہے کہ وہ آسمانی کتابیں ہیں لیکن اس تصدیق کے بھی یہ معنی نہیں کہ وہ ان کو محفوظ قرار دیتا ہے اور اگر ان صحائف کے پیروکار اپنی اپنی کتب پر ایمان وعمل کرتے رہیں تو یہ ان کی نجات کے لیے بھی کافی ہو گا بلکہ اس تصدیق کے ساتھ ساتھ قرآن یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ وہ کتابیں اور صحائف تحریف زدہ ہو چکی ہیں اور اب ان میں حق وباطل کا امتیاز مٹ چکا ہے لہٰذا اب وہ کتابیں قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد راہِ نجات صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لایا جائے، اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نجات نہیں، اس قانون میں استثنیٰ صرف ان لوگوں کو حاصل ہو گا جن کو آپ ﷺ ﷺ کے مبعوث ہونے کی خبر بالکل ہی نہ پہنچی یا ایسے طریقے سے پہنچی کہ جس کے ذریعہ حجت تام

نہیں ہوتی یعنی بلوغِ دعوت کی شرائط اس میں مفقود تھیں اور اس چیز کا علم صرف اللہ کے پاس ہے کہ کس انسان تک کس درجہ کی دعوت پہنچی اور اس پر حق کی توضیح و تبیین کس درجہ کی ہوئی تھی۔

نتائجِ بحث

1. عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد یہود "اہل الفترۃ" میں داخل نہیں۔
2. غیرِ بنی اسرائیل جنہوں نے یہودیت کو قبول کیا بعثتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی "اہل الفترۃ" میں شامل ہیں۔
3. وہ یہودی بھی "اہل الفترۃ" میں داخل متصور ہوں گے جن تک عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت نہ پہنچی ہو۔
4. وہ تمام لوگ بھی "اہل الفترۃ" میں داخل ہیں جن تک کسی بھی زمانہ میں کسی بھی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔
5. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد راہِ نجات صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے، اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نجات نہیں۔
6. عذاب سے استثنیٰ صرف ان اہل کتاب کو حاصل ہو گا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خبر بالکل ہی نہ پہنچی یا ایسے طریقے سے پہنچی کہ جس کے ذریعہ حجت تام نہیں ہوتی۔
7. قرآن مجید کی وہ آیات جن میں محض اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نیز عملِ صالح کو ذریعۂ نجات قرار دیا گیا ہے ان کے مفہوم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان بھی داخل ہے۔